شاہد حسین رزاقی

یونانی جمہوریت کا ارتقاء

عہدِ قدیم میں مشرق کی وسیع شہنشاہیتوں کے برعکس یورپ کے جنوب مشرقی حصہ میں چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قائم ہوئیں جو قدیم یونان کی شہری مملکتوں کے نام سے مشہور ہیں اور جنہوں نے جمہوری نظامِ حکومت اور جمہوری تفکر کی ترقی میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے۔ یونان میں شہری مملکت کے قیام اور ترقی کا سبب اس کی جغرافی حالت اور تمدنی ارتقاء ہے۔ ہزاروں سال پہلے بحرِ روم کا پانی جنوب مغربی یورپ میں کچھ اسی طرح پھیل گیا کہ سینکڑوں جزیرے بن گئے۔ یہ جزیرے پہاڑی تھے۔ پہاڑوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے میدان تھے اور ان میدانوں میں جدا جدا آبادیاں تھیں جن میں سے ہر ایک کی اپنی علاحدہ تہذیب تھی۔ آگے چل کر یہ مختلف تہذیبیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے لگیں اور اس سے دنیا کی ایک بہت بڑی تہذیب کی داغ بیل پڑی۔ قدیم یونانی تہذیب کا پہلا مرکز کریٹ تھا۔ جہاں ۲۰۰۰ ق۔م میں مینوئی قوم خوب ترقی کر گئی تھی اور آئندہ پانچ صدیوں میں ان کی تہذیب بامِ عروج پر پہنچ گئی۔ یہ ترقی ۱۴۰۰ ق۔م تک جاری رہی اور مینوئی قوم اور اس کی تہذیب تباہ ہو گئی۔ اسی زمانہ میں وسط ایشیا کے نیم وحشی قبائل بھی یونان میں داخل ہونے لگے تھے۔ پہلے تو یہ شمال میں آباد ہوئے اور پھر جنوبی علاقوں میں۔ آگے چل کر ان نوواردوں قبائل اور مقامی باشندوں کی مخلوط اولاد "ہیلن" یا یونانی کہی جانے لگی۔ یہ لوگ بتدریج اس قدر طاقتور ہو گئے کہ انہوں نے مینوئی اقتدار بالکل ختم کر دیا اور ایتھنز و مائسینی خود ان کے دو اہم مرکز بن گئے۔ ان میں سے آگے چل کر ایتھنز نے غیر معمولی عظمت و شہرت حاصل کی۔

شہری مملکت

قدیم یونان میں مملکت اور قوم کا تصور موجودہ تصور سے مختلف تھا۔ یونان ایک مملکت نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی مملکتوں کا مجموعہ تھا۔ اور یونانی مملکتیں یونان، اطالیہ، شمالی افریقہ اور ایشیائے کوچک میں پھیلی ہوئی تھیں ان کی تعداد سینکڑوں تھی اور اگرچہ ان میں نسل و زبان کا اشتراک تھا لیکن سیاسی اعتبار سے یہ بالکل خود مختار تھیں۔ یہ سب شہری مملکتیں تھیں۔ شہری مملکت کے آغاز کے بارے میں یہ خیال ہے کہ کسی پہاڑی کے ارد گرد رہنے والے باشندے پہاڑی پر قلعہ بند کر کے اس کو اپنے مذہبی سیاسی اور معاشرتی مرکز کے طور پر استعمال کرنے لگتے تھے۔ ان لوگوں میں اتحاد کا بڑا ذریعہ صرف مذہب تھا لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے متحد ہونے کی ضرورت کو بھی محسوس کیا اور اسی مقصد کے تحت ارد گرد کی آبادیوں اور ان کے خود مختار اداروں کو متحد کیا جانے لگا۔ اس اتحاد سے شہری مملکت کی ابتدا ہو گئی اور رفتہ رفتہ یہ قلعہ اور اطراف کا علاقہ چھوٹی سی خود مختار ریاست بن گیا۔ شہری مملکت کے ارتقاء کی واضح مثالیں ایتھنز اور ملیس کی مملکتوں سے ملتی ہیں جو مختلف بستیوں اور قلعہ نما آبادیوں کے اتحاد سے قائم ہوئی تھیں۔ ان شہروں میں پہاڑ کی چوٹی پر

مندر بنائے جاتے تھے۔ ڈھلان پر امرا کے مکان اور مارکٹ وغیرہ۔ اور پہاڑی کے دامن میں بڑے کسانوں کے مکان ہوتے تھے۔ چھوٹے کاشتکار عموماً پہاڑی سے متصل مواضعات میں رہتے تھے جو شہر کا حصّہ شمار کئے جاتے تھے اور سب باشندے اسی مملکت کے شہری کہلاتے تھے۔ یونانی ریاستوں میں شہری حقوق صرف فاتح قبائل کے آزاد افراد کو حاصل تھے۔ اور مفتوح باشندے حقوق سے محروم غلام تصور ہوتے تھے۔ شہریوں کے بارے میں یونانیوں کا یہ نظریہ تھا کہ ہر مملکت آزاد شہریوں کا ایک ایسا مجموعہ ہوتی ہے جس کے شہری حقوق سکونت کی بنا پر نہیں بلکہ شہری کی اولاد ہونے کی بنا پر حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ کسی مملکت کا شہری خواہ وہ کہیں بھی رہتا اسی مملکت کا شہری تصور کیا جاتا تھا جہاں کے شہری حقوق اس کے والدین کو حاصل تھے۔ مثلاً اگر اسپارٹا کا کوئی شہری اپنا وطن چھوڑ کر ایتھنز چلا جاتا اور وہاں سکونت اختیار کر لیتا تب بھی وہ اسپارٹا کا شہری ہی تصور کیا جاتا اور ایتھنز میں اس کی حیثیت غیر ملکی کی ہوتی۔

یونان میں شہری مملکت کے ارتقاء کے بارے میں نامور یونانی مفکر ارسطو اور مشہور مؤرخ تھوسی ڈائیڈیز نے بھی اپنی تصانیف میں اظہار خیال کیا ہے۔ تھوسی ڈائیڈیز نے لکھا ہے کہ یونان میں ایک نسل آباد نہ تھی بلکہ مختلف چھوٹے چھوٹے قبیلے تھے جن کے آثار خود اس کے زمانہ میں بھی پائے جاتے تھے۔ ان میں رابطہ باہمی قبائلی بنیادوں پر قائم تھا اور ان کے سیاسی معاشرہ کی اکائی گاؤں تھا۔ ارسطو کا خیال ہے کہ گاؤں بجائے خود ایک آزاد سیاسی وحدت تھا جس کی اکائی خاندان تھا اور یونانی شہری مملکت کی عمارت اسی بنیاد پر تعمیر ہوئی۔ قدیم یونانی قبائل دو قسم کے تھے۔ ایک قسم تو مختلف خاندانوں کا مجموعہ تھی اور دوسری وسعت یافتہ خاندان یا عشیرہ تھی ان ہی قبائل کے باہم ملنے سے مملکت کی تشکیل ہوئی۔ چونکہ مملکت کے بارے میں یونانیوں کا بنیادی تصور یہ تھا کہ ہر مملکت کو خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو، یہ حق حاصل ہے کہ وہ آزاد رہے۔ اپنے اوپر خود ہی حکومت کرے اور دوسری شہری مملکتوں سے جس طرح مرضی ہو تعلقات قائم کرے۔ اس لحاظ سے ان مملکتوں کی تعداد سینکڑوں ہو گئی۔ جو رقبہ اور آبادی میں بہت ہی چھوٹی تھیں۔ چنانچہ بیوتا میں جس کا رقبہ ایک معمولی ضلع کے برابر تھا آٹھ مملکتیں تھیں۔ جزیرہ سیوس صرف بارہ میل لمبا اور آٹھ میل چوڑا تھا لیکن اس میں چار مملکتیں قائم تھیں۔ جن کی حکومتیں، دستور، فوجیں سب بالکل الگ تھیں اور یہ اپنی مرضی سے ایک دوسرے سے جنگ، صلح اور معاہدے کرتی تھیں۔

دورِ ملوکیت یونانِ قدیم میں بھی پہلا دور ملوکیت کا تھا اور بادشاہت کی ابتداء الہٰی اقتدار سے ہوئی۔ قبائلی سردار بہت با اختیار تھے اور سپہ سالار، منصف اور مذہبی پیشوا کی حیثیت سے وسیع اختیارات استعمال کرتے تھے۔ لیکن قبائلی روایات کے پابند ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ سردار جو جنگوں کے قائد ہوتے تھے، فاتح اور بادشاہ بن گئے۔ پہلے ان بادشاہوں کی نوعیت معاہدہ کے مطابق حکومت کرنے والے یعنی دستوری حکمرانوں کی تھی۔ لیکن آگے چل کر یہ بادشاہت مطلق العنان اور موروثی بن گئی۔ ابتداء میں یہ اصول تھا کہ بادشاہ کا انتخاب جنگ میں قیادت کے لئے کیا جاتا تھا اور یہ منتخب شدہ بادشاہ اور اس کی رعایا دونوں یہ عہد کرتے تھے کہ وہ اپنے فرائض پورے کریں گے۔ لیکن انتخاب کا اصول رفتہ رفتہ نظر انداز کیا جانے لگا اور وراثت کو

بنیادی اہمیت حاصل ہوگئی۔ یہاں تک کہ یہ خیال عام ہوگیا کہ اعلےٰ اوصاف صرف اعلیٰ خاندان میں پیدا ہونے والے شخص میں ہی ہو سکتے ہیں۔ پیدائشی برتری کا یہ تصور نہ صرف ملوکیت بلکہ اعیانیت میں بھی جاری رہا۔ آگے چل کر بادشاہ دیوتاؤں کی اولاد سمجھے جانے لگے۔ یہ بادشاہ نہ صرف حاکم اعلےٰ اور سپہ سالار اعظم ہوتے تھے بلکہ اعلےٰ ترین مذہبی پیشوا اور یونان کے عظیم ترین دیوتا زیوس کے احکام کے تاویل کنندہ بھی تسلیم کئے جاتے تھے۔ انہیں ملکی قوانین کی تاویل اور عدالت کے اعلےٰ ترین اختیارات بھی ان کو حاصل تھے۔ عہد قدیم کے ان مطلق العنان حکمرانوں پر اگر کوئی اثر تھا تو صرف بڑے بڑے قبائلی سرداروں کا۔ چنانچہ قبیلہ کے بااثر خاندانوں کے بزرگوں پر مشتمل ایک کونسل ہوتی تھی جو بادشاہ کو مشورہ دیتی تھی۔ اس کونسل کو بول کہتے تھے۔ پہلے تو یہ کونسل صرف مشورہ کی غرض سے بادشاہ طلب کرتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ نظم ونسق کے فرائض میں بھی شریک ہوگئی۔ یہ کونسل جمہوری ریاستوں میں بھی باقی رہی۔ لیکن اس بنیادی تبدیلی کے ساتھ کہ کونسل عوامی اسمبلی کے تابع تصور کی جانے لگی اور اس کے رکن قرعہ اندازی کے ذریعہ منتخب ہونے لگے۔ غیر جمہوری ریاستوں میں یہ کونسل بدستور با اقتدار رہی۔ یونان کی ہر ایک دستوری مملکت میں خواہ وہ ملوکیت ہوتی یا عدیدیت یا جمہوریت بول ضرور ہوا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ دور جابریت میں بھی یہ برقرار رہی۔

عہد قدیم کی یہ ملوکیت اپنے انتہائی عروج پر پہنچنے کے بعد زوال پذیر ہوگئی اور آٹھویں صدی قبل مسیح کے وسط سے یونانی ملوکتیں یکے بعد دیگرے ختم ہونے لگیں۔ یونانی حکمران نہ صرف بول بلکہ عوامی اسمبلی کی مرضی کے بھی پابند ہوگئے جو آگورا کہی جاتی تھی اور اس طرح ملوکیت کے زوال سے اعیانیت اور اس کے بعد جمہوریت کے قیام کی راہ ہموار ہونے لگی۔ لیکن یہ تبدیلی کسی انقلاب کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ رفتہ رفتہ ہوئی۔ پہلے تو بادشاہ کے اختیارات بتدریج کم کئے گئے اور اس میں بڑا حصہ امرا کا تھا جنہوں نے جمہوریت یا عوامی حقوق کے لئے نہیں بلکہ اپنا اقتدار بڑھانے کے لئے بادشاہ کا اقتدار کم کرنے کی جدوجہد کی۔ موروثی حکمرانوں کی جگہ منتخب شدہ عہدہ داروں یا مجسٹریٹوں کی حکومت قائم ہوئی۔ یہ اعلےٰ عہدہ دار آرکن کہلاتے تھے۔ مقررہ مدت کے لئے منتخب کئے جاتے تھے اور ان کے انتخاب میں امراء کی پسند کو بڑا دخل تھا۔

اعیانیت

یونانی ریاستوں میں بادشاہوں کے خاتمہ سے امرا کی طاقت کو فروغ ہونے لگا اور ملوکیت کی جگہ اعیانیت نے لےلی۔ امرا بادشاہوں کے زمانہ میں بھی با اختیار اور طاقتور تھے۔ بادشاہ ان کے مشورہ سے حکومت کرتا تھا۔ مفتوحہ ممالک میں ان کو بھی حصہ ملتا تھا اور ان کی دولت ان کے حقوق اور قوت کی نگہبان تھی۔ دور ملوکیت میں زیادہ اقتدار شاہی خاندان والے عشیرہ کو حاصل ہوتا تھا۔ اعیانی دور میں تمام امراء کے عشیرے اقتدار حکومت میں شریک ہوگئے اور ان عشیروں پر مشتمل امرا کا ایک با اختیار اور با اقتدار طبقہ بن گیا جو یوپاٹریڈ کہلاتا تھا۔ جس طرح پہلے بادشاہ کو دیوتا کی اولاد تصور کیا جاتا تھا۔ اسی طرح اعیانی دور میں رفتہ رفتہ امرا بھی فوق البشر سمجھے جانے لگے۔ امرا کا ہر عشیرہ کسی دیوتا یا قومی ہیرو کے نام سے موسوم ہوگیا اور محض پیدائش کی بنا پر سا اعلےٰ اعلےٰ مراتب کے مستحق اور بہترین اوصاف کے حامل تصور کئے جانے لگے۔ یہ امرا مذہبی فرائض انجام

دیتے۔ فوجوں کے سپہ سالار ہوتے۔ حکومت کے قوانین کی تاویل اور عدالتی فیصلے کرتے اور عزت و حکومت کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ امرا بڑے زمیندار اور دولت مند تھے اور یہی دولت ان کے اقتدار کا ذریعہ تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے دولت مند طبقہ کی اعیانیت قائم ہوئی۔ رفتہ رفتہ اعیانیت نے عدیدیت کی شکل اختیار کر لی۔ امرا کی حکومت موروثی بن گئی اور باپ کے بعد بیٹا حکومت کا سربراہ ہونے لگا۔

عدیدیت

یہ عدیدیت اعیانیت کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ جس نظام میں صرف چند مقتدر امرا حکومت کرتے تھے اور ان کی حکومت مفادِ عامہ پر ذاتی مفاد کو ترجیح دیتی تھی۔ ہومر کی نظموں میں جس قسم کی حکومت کا تذکرہ ہے وہ عدیدیت کی ابتدا تھی۔ اور آٹھویں صدی قبل مسیح کے اختتام سے قبل یونانی ریاستوں میں عام طور سے عدیدی نظام حکومت ہی قائم ہو چکا تھا۔ ان میں ایتھنز، اسپارٹا، سائپرس، سائرس، آرگوس، ایلس، تھیبس اور ایجینا زیادہ اہم تھیں۔ بعض عدیدیتیں کئی صدیوں تک قائم رہیں۔ عدیدی نظام کے خاتمہ پر جمہوری نظام کو فروغ ہونے لگا۔ اور آخرکار یونانی جمہوریت نے اتنی ترقی کی [illegible] اس کو ایک ممتاز مرتبہ حاصل ہو گیا۔ جمہوریت کی ابتدا کے لئے سازگار حالات دراصل اعیانی اور عدیدی [illegible] کی خرابیوں نے پیدا کر دیئے تھے۔ جن کا نتیجہ پہلے تو جابروں کے عروج کی شکل میں نکلا پھر عوام نظام حکومت پر [illegible] ہونے لگے۔

جابریت

امرا کی حکومتوں میں غریبوں پر بہت تشدد ہوتا تھا جس سے تنگ آ کر ان میں اپنا وطن چھوڑنے اور نئی بستیاں بسانے کا خیال پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ سیاسی اور معاشی حالات اس قدر نازک ہو گئے کہ ان پر قابو پانا حکومت کے لئے بہت دشوار مسئلہ بن گیا۔ ایسے مشکل اور بحرانی دور میں یونان کی متعدد ریاستوں میں کچھ اولوالعزم افراد غیر مطمئن اور شاکی طبقوں کے رہنماؤں کی حیثیت سے نمودار ہوئے اور ان کی مدد سے حکومت پر قبضہ کر کے مطلق العنان حکمران بن گئے۔ یہ لوگ جابر کہے جانے لگے۔ کیونکہ ان کی حکومت قانون و روایات کے بجائے جبر و استبداد اور قوت پر مبنی تھی۔ قدیم یونان میں مطلق العنانی اور غیر ذمہ داری جابریت کی لازمی خصوصیات سمجھی جاتی تھیں اور جابر ایک ایسا بے آئین مقتدر متصور ہوتا تھا جو اپنے اقتدار کے لئے اخلاقی ذمہ داریوں اور قوانین مملکت کو نظر انداز کر دیتا تھا اور جس کی حکومت مفاد عامہ کے بجائے محض ذاتی مفاد و اغراض کی تابع ہوتی تھی۔ ارسطو نے بھی ملوکیت اور جابریت میں یہی بنیادی فرق بتلایا ہے۔ لیکن ان جابروں میں بعض مستثنیات بھی نظر آتی ہیں۔ مثلاً ایتھنز کا جابر پسسٹراٹس جو اپنے کارناموں اور فلاح عامہ کے کاموں کے اعتبار سے قومی ہیرو سے کم نہیں۔ یونانی ریاستوں میں ایسے متعدد جابروں کی حکومت رہی ہے جو ظالم و غاصب نہ تھے بلکہ نازک وقت میں اپنی ریاست کے نجات دہندہ ثابت ہوئے اور ان کی مطلق العنانی اہم قومی مشکلات کو حل کرنے کا ذریعہ بنی۔ یہی سبب ہے کہ ارسطو نے جابریت کی ایک اور قسم بھی قرار دی ہے جس کو وہ انتخابی جابریت کہتا ہے۔ ایرانی حملوں یا دوسری قومی مشکلات کی وجہ سے یونانی ریاستوں میں بڑے نازک حالات پیدا ہو جاتے تھے۔ اور ان پر قابو پانے کی صرف یہی صورت نظر آتی تھی کہ

کسی قابل شخص کو کامل اختیارات دے کر مطلق العنان حکمران بنا دیا جائے۔ چنانچہ ایتھنز میں سولن اور لوکری میں زیلوکس
اسی طریقہ سے بہت با اختیار حکمران بنائے گئے تھے اور ان کا یہ اقتدار ملک کے لئے نہایت مفید ثابت ہوا۔ مطلق العنانی
یا جابریت کی یہ دستوری شکل تھی اور اس میں جابر قوم کی مرضی سے مطلق العنان حکمران بنتا تھا۔ اس لئے ارسطو نے اس کو
انتخابی بھی قرار دیا ہے۔

جمہوریت

بادشاہ اور امرا کے علاوہ یونان قدیم میں تیسرا عنصر عوام تھے جن کا اقتدار میں کوئی حصہ نہ تھا۔ بادشاہت
کے خاتمہ کے بعد مجسٹریٹ برسر اقتدار لائے گئے۔ لیکن یہ دور مجسٹریسی زیادہ دیر پا نہ ہوا اور ایک
خود مختار ادارہ کی حیثیت سے یہ نظام زیادہ مدت تک برقرار نہ رہ سکا۔ اسلئے عہدہ دار امرا کی کونسل کے تابع ہو گئے۔ اس کے
بعد جب اعیانیت ختم ہوئی تو آگورا یا عوامی اسمبلی نمودار ہوئی اور روز افزوں طاقت حاصل کرنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ
مجسٹریٹوں اور کونسل کے اختیارات کی جامع بن گئی۔ عوامی اسمبلیوں کے اس اقتدار سے یونانی ریاستوں میں جو دور شروع
ہوا وہ جمہوری دور کہلاتا ہے۔ جمہوری مملکت میں آزاد شہریوں کی اسمبلی نظم و نسق کی نگراں اور عوامی عدالت عالیہ کی
حیثیت سے کام کرنے لگی۔ اور آزاد شہریوں کی اس حکومت کو یونانیوں نے جمہوریت کا نام دیا۔ یونانی جمہوریت کا بنیادی
اصول یہ تھا کہ ایک آزاد شہری اپنے اس حق کی بنا پر کہ وہ آزاد شہری پیدا ہوا ہے حکومت کے ہر عہدہ پر تقرر کا مجاز
ہوتا ہے۔ اس کو حکومت کے کاموں میں براہ راست حصہ لینے کا حق حاصل ہے اور ہر آزاد شہری خواہ امیر ہو یا غریب اس
لئے ہر آزاد لحاظ شہری اور دستوری حقوق کے اعتبار سے مساوی ہے۔ ارسطو نے اس اصول کو عددی مساوات کا نام دیا ہے
اور نظری اعتبار سے واقعی یہ بہت اہم اصول تھا۔ لیکن عملاً یہ اس لئے زیادہ مفید نہ تھا کہ حکومت میں حصہ لینے کے مجاز
شہری میں جب تک اس کام کو انجام دینے کی قابلیت بھی نہ ہوتی اس کا یہ حق اس کے لئے بیکار تھا۔ یہی سبب ہے کہ جمہوری
دور میں بھی اعیان ہی حکومت پر اثر انداز ہوتے رہے اور خود عوام اور عوامی تحریکوں کے رہنما بھی اسی طبقہ سے تعلق
ہوتے۔ تھوسی ڈائڈیز کے نزدیک قدیم یونانی جمہوریت کی امتیازی حیثیت یہ تھی کہ اس میں ہر طبقہ کو اس کے مناسب حال
مرتبہ ملتا تھا۔ اور اس نظام میں دولت مند مملکت کی دولت کے محافظ، دانش مند اس کے مشیر اور عوام اس کی پالیسیوں کو جانچنے
والے اور نقاد ہوتے تھے۔ تنقید و محاسبہ کا یہ حق ہی دراصل یونانی جمہوریت میں ایک ایسا اصول تھا جس سے کام لے
کر عوام حکومت پر اثر انداز ہوتے تھے۔ اور یہ اصول ارسطو کے نزدیک بھی بہت اہم تھا۔ کیونکہ اس حق کی وجہ سے
عوامی اسمبلی افراد کی غلطیوں کی اصلاح کر دیتی تھی اور عوام کا مشترکہ فیصلہ عموماً درست ہی ہوا کرتا تھا۔

قدیم یونانی جمہوریت موجودہ جمہوریت سے کئی اعتبار سے مختلف تھی اور بعض ایسی بنیادی خصوصیات سے عاری تھی جن
کو آج جمہوریت کی روح تصور کیا جاتا ہے۔ سب سے بڑی خرابی قدیم یونانی تہذیب اور معاشرتی نظام کی پیدا کردہ تھی
جو غلامی پر مبنی تھے۔ اور جن کی وجہ سے آبادی کی بہت بڑی اکثریت جو غلاموں پر مشتمل تھی تمام حقوق سے محروم کر دی

گئی تھی۔ چنانچہ ہر یونانی مملکت میں تمام شہری اور جمہوری حقوق صرف ایسے آزاد شہریوں کو حاصل تھے جن کی تعداد اس ریاست میں ایک چوتھائی یا اس سے بھی کم ہوتی تھی۔ ریاست کورنتھ میں ساڑھے چار لاکھ سے بھی زیادہ غلام موجود تھے۔ ایجینا میں غلاموں کی تعداد آزاد شہریوں کی دس گنی اور ایتھنز میں پانچ گنی تھی۔ اسپارٹا اور دوسری ریاستوں میں بھی یہی کیفیت تھی۔ ان غلاموں کی محنت کا پھل کھانے والے آزاد شہری تو سیاست و حکومت میں حصہ لیتے تھے لیکن خود غلام ان حقوق سے یکسر محروم تھے اس طرح یونانی ریاستوں میں جمہوریت اور اس کے عطا کردہ حقوق سے شہریوں کی تھوڑی سی تعداد مستفید ہوتی تھی۔ یہ اتنی اہم اور بنیادی خرابی ہے کہ موجودہ تصور کے مطابق اس کو جمہوریت کا نام تک نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ہم قدیم یونانی اداروں کو اس زمانہ کی تہذیب و معاشرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جانچیں۔ اس معاشرہ میں غلامی عام تھی۔ اس کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اور اقتصادی نظام کو برقرار رکھنے کے لئے یہ ناگزیر تھی۔ سولن کے زمانہ میں آزاد شہریوں کو غلام بنانے کے طریقوں کو شہریوں پر بدترین ظلم تصور کیا جاتا تھا لیکن غلامی کو ختم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ افلاطون کو ان بدقسمتوں سے گہری ہمدردی تھی اور وہ آزاد شہری کے غلام بن جانے کے خطرہ کو موت سے بھی زیادہ خوفناک سمجھتا تھا لیکن اس نے بھی اپنے جمہوری خاکہ میں نظام غلامی کو ختم کرنے کی تحریک نہ کی۔ ارسطو نے تو غلاموں کو ایک مستقل معاشری عنصر قرار دیا ہے اور محکوم طبقہ کو معاشرتی نظام کے لئے ضروری تصور کرتا ہے۔ اس کا یہ نظریہ ہے کہ قدرت نے بھی انسان کی صلاحیتوں میں فرق رکھا ہے۔ چنانچہ کچھ تو پیدائش ہی سے حکومت کے لئے موزوں ہوتے ہیں اور کچھ غلامی کے لئے۔ غلام عموماً وہی لوگ بنتے ہیں جو ادنیٰ صلاحیتوں کے ہوتے ہیں۔ قدرت بھی اس کا لحاظ رکھتی ہے۔ چنانچہ غلاموں کو تو جسمانی مشقت کے لئے تنومند بناتی ہے اور آزاد شہریوں کو ذہین و عقلمند تاکہ وہ سیاست و حکومت اور جنگ و امن جیسے مشکل مسائل کو حل کر سکیں۔ گویا کہ قدرت بعض انسانوں کو غلام اور بعض کو آزاد شہری پیدا کرتی ہے اور غلاموں کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ غلام رہیں۔ اپنے اس نظریہ کے باوجود ارسطو کو غلاموں سے ہمدردی تھی اور وہ ان سے بہتر سلوک کرنے کی تلقین کرتا تھا اور اس کا یہ خیال تھا کہ ذہین اور محنتی غلام کو آزاد ہونے کا موقع دیا جائے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ قدیم یونان میں غلاموں کی حالت اتنی خراب نہ تھی جتنی کہ انیسویں صدی کے امریکہ میں اور شاید اسی لئے اس نظام کو ختم کرنے کی ضرورت نہ محسوس کی گئی۔ عددی ریاستوں سے مقابلہ کرتے ہوئے جمہوری ریاستوں میں غلاموں سے بہتر سلوک ہوتا تھا اور آقا ان کا خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ زینوفون نے اسپارٹا کے محروم حقوق شہریوں سے ایتھنز کے غلاموں کا مقابلہ کرتے ہوئے یہ شکایت کی ہے کہ اس شہر میں غلاموں کو بڑی آزادی حاصل ہے۔ کیونکہ وہ کوئی علاحدہ لباس نہیں پہنتے جب کسی آزاد شہری کو دیکھتے ہیں تو سڑک کی دوسری طرف نہیں ہو جاتے اور اپنی زندگی کا حصہ دار تصور کرتے ہیں۔ ایتھنز میں غلاموں کی یہ حالت زینوفون کو اس لئے بہت بری معلوم ہوتی تھی کہ اسپارٹا میں ان کی حالت نہایت خراب تھی اور ان پر بڑے مظالم ہوتے تھے۔ یونانی ریاستوں میں غلاموں کا تناسب

بن جاتا تو ممکن تھا لیکن پورے شہری حقوق سے وہ آزادی کے بعد بھی محروم ہی رہتے تھے۔ غلاموں کی آزادی کے تین طریقے تھے۔ حکومت آزاد کر دے۔ مالک آزاد کر دے یا خود غلام اپنی قیمت ادا کر کے آزادی حاصل کر لے۔ لیکن اس آزادی کے بعد بھی غلام کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ سابق آقا کو اپنا سرپرست بنائے ورنہ اس کو مبارزہ کرنا پڑتا اور اس میں ہار جانے کی شکل میں دوبارہ غلام بنا لیا جاتا نیز اس کی املاک بھی ضبط کر لی جاتی تھی۔ اس طرح غلامی یونانی معاشرت کا ایک ایسا عنصر بن گئی تھی جس کو معاشرتی اور اقتصادی نظام کو برقرار رکھنے کے لئے لازمی تصور کیا جاتا تھا اور جمہوریت کی انتہائی ترقی بھی اس بنیادی نقص کو دور نہ کر سکی۔ اور یونانی جمہوریت مساوات کے تصور سے ناآشنا رہی۔

قدیم یونانی تہذیب میں دوسرا بنیادی نقص یہ تھا کہ اس معاشرہ میں عورتوں کا درجہ بہت پست تھا۔ وہ مردوں کی محکوم تھیں اور زندگی کے مختلف اہم شعبوں میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا۔ عورتوں کی حالت دراصل غلاموں سے بھی زیادہ خراب تھی۔ آزاد عورتیں بھی صدر خاندان اور مردوں کی تابعدار ہوتی تھیں اور ان سے بہت برا سلوک کیا جاتا تھا۔ یونان کے ابتدائی غیر ترقی یافتہ معاشرہ میں عورت کی حالت مقابلتاً بہتر تھی لیکن ترقی یافتہ یونانی معاشرہ میں بدتر ہو گئی۔ چنانچہ ہومر کی تحریروں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عورتوں کو بھی معاشرہ میں ایک مرتبہ حاصل تھا۔ اس کے بعد ہیروڈوٹس کے عہد میں بھی عورتوں کے اثرات نظر آتے ہیں۔ لیکن عہد پرکلیز کے ترقی یافتہ ایتھنز کے مورخ تھوسی ڈائڈیز کی تحریروں سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عورت کا وجود تک نہ تھا۔ پرکلیزی ایتھنز میں عورتیں مکان کی بالائی منزل پر علاحدہ کمروں میں رہتی تھیں۔ ان کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ تعلیم سے محروم رکھی جاتیں اور اپنے زمانہ کی علمی، ادبی اور سیاسی ہر قسم کی تحریکوں سے بالکل ناواقف ہوتی تھیں۔ ازدواجی زندگی ناخوشگوار ہوتی تھی۔ شوہر عموماً بیوی سے بہت زیادہ عمر کا ہوتا تھا۔ لڑکی کی نسبت صرف والدین کی مرضی سے ہوتی تھی اور اس کو اپنے منسوب کو دیکھنے کی اجازت نہ تھی۔ شادی کو محض ایک معاشرتی ضرورت سمجھا جاتا تھا اور ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کا تصور تک نہ تھا۔ اس معاشرہ میں عورت کو شریف قرار دینے کا یہی معیار تھا۔ جو اس سے مختلف ہوتیں وہ طوائفیں کہلاتی تھیں۔ طوائفوں کو تعلیم بھی دی جاتی تھی اور فنون لطیفہ میں بھی مہارت حاصل کرتی تھیں۔ ان طوائفوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور یہ ایتھنز کے ممتاز شہریوں اور ارباب حکومت کی داشتائیں ہوتی تھیں۔

جو ریاستیں ایتھنز یا کورنتھ کے مقابلہ میں کم ترقی یافتہ تھیں وہاں عورتوں کی حالت مقابلتاً بہتر تھی چنانچہ اسپارٹا میں افراد کی زندگی پر حکومت کی گرفت بہت سخت ہونے کے باوجود عورتوں سے بہتر سلوک کیا جاتا تھا۔ وہاں یہ تصور کارفرما تھا کہ عورتیں آزاد شہریوں کی رفیقۂ حیات ہوں گی اور آئندہ نسل ان ہی کی گود میں پلے گی۔ اس لئے ان کو خاص طور پر تربیت دینا ضروری ہے۔ چنانچہ نظم و ضبط کی پابندی اور جسمانی صحت کو ترقی دینے کے لئے ورزشیں ان کے لئے بھی لازمی کر دی گئی تھیں۔ اسپارٹی عورتیں مردوں سے آزادانہ ملتی تھیں۔ تمام تقریبوں میں حصہ لیتی تھیں اور کھیل

کے مختلف شعبوں پر اثر انداز ہوتی تھیں۔ اسپارٹا کے آخری دور میں تو عورتوں کے اثاثات بہت بڑھ گئے تھے۔ ایتھنز اور اسپارٹا میں عورتوں کی حالت کا موازنہ کرنے سے اس خیال کو تقویت ہوتی ہے کہ یونان میں تہذیب و تمدن اور ذہن و فکر کی ترقی کے ساتھ ساتھ عورتوں کی حالت پست تر ہوتی گئی اور شہری مملکت کا دورِ عروج و عظمت عورتوں کی انتہائی پستی اور محکومی کا دور تھا۔

یونانی جمہوریت کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں نمائندگی کا اصول نہ تھا بلکہ ہر آزاد شہری حکومت میں براہِ راست حصہ لیتا اور قومی اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہو کر رائے دیتا تھا۔ اس کے علاوہ عاملہ اور مقننہ میں تفوق دعویٰ اور آزاد شہری ہی ان اختیارات کے حامل تھے۔ حکومت کے سب عہدے انتخابی تھے۔ آزاد شہری براہِ راست عہدہ داروں کا انتخاب کرتے تھے اور یہ عہدہ داران کے سامنے جواب دہ بھی تھے۔ حکومت میں براہِ راست حصہ لینے کی وجہ سے سیاسی زندگی میں بڑی شدت تھی۔ شہری اپنی مملکت کے نظم و نسق کی تفصیلات سے آگاہ رہتے اور ریاست کو زندگی کے دوسرے شعبوں پر تفوق حاصل تھا۔ اس قسم کا نظامِ حکومت محدود علاقوں میں ہی قائم رہنا ممکن تھا۔ اور یونانی مملکتوں میں اس لئے قابلِ عمل اور کامیاب ثابت ہوا کہ یہ سب چھوٹی چھوٹی شہری مملکتیں تھیں۔

یہ مملکتیں اس قدر چھوٹی تھیں کہ جب کوئی بڑا خطرہ لاحق ہوتا تو کسی ریاست کے لئے تنہا اس کا مقابلہ کرنا ممکن نہ ہوتا اور اس کا نتیجہ ریاستوں کے ایسے محالفوں اور عہد ناموں کی شکل میں نکلا جن میں سینکڑوں ریاستیں شامل ہوتی تھیں۔ یونانی ریاستوں کی اس خصوصیت کو آئندہ زمانوں میں بھی اختیار کیا گیا اور موجودہ زمانہ میں بھی جمہوری طاقتوں کے اتحاد کو جمہوریت کے تحفظ کی سب سے بڑی ضمانت تصور کیا جاتا ہے۔ یونانی ریاستوں نے اس قسم کا پہلا اتحاد ایرانی حملوں کی مدافعت کے لئے اسپارٹا کی سرکردگی میں کیا تھا۔ جو یونانی لیگ کے نام سے موسوم ہوا۔ اس کے بعد ایتھنز کی قیادت میں یونانی ریاستوں کی بحری قوت کو ڈیلین لیگ کی شکل میں متحد کیا گیا۔ اور آگے چل کر یہ اتحاد ہی ایتھنز کی شہنشاہیت کے قیام کا ذریعہ بنا۔ ایتھنز اور اسپارٹا یونانِ قدیم کی دو اہم ترین مملکتیں اور ایک دوسرے کی رقیب تھیں اور ان کی یہ رقابت دونوں کے لئے تباہیوں کا باعث بنی۔ ایتھنز کے روز افزوں اقتدار کو روکنے کے لئے اسپارٹا نے اپنے حلیفوں کو پیلوپونیشی اتحاد کے رشتہ میں منسلک کیا اور ایتھنز کو شکست دینے کے بعد اس محالفہ کو اسپارٹن شہنشاہیت کی شکل دینے لگا لیکن اس کی تکمیل سے قبل ہی اسپارٹا کی قوت ٹوٹ گئی۔ ایتھنز اور اسپارٹا دونوں کا اقتدار ختم ہونے کے محرک یہی محالفے ثابت ہوئے جو ان کی شہنشاہیتوں کے قیام کا ذریعہ بنے تھے۔ اس کے بعد یونانی ریاستوں کے آخری دور میں جب رومنوں کو عروج ہوا تو ان ریاستوں نے اپنی مدافعت کے لئے ایکین لیگ اور ایٹولین لیگ کے نام سے دو محالفے قائم کئے۔ جن میں شریک ہونے والی ریاستوں کے لئے اپنے کچھ اعلیٰ اختیارات لیگوں کو تفویض کرنا ناگزیر ہو گیا تھا اور اس طرح یونانی ریاستوں نے وفاقی نظام اور وفاقی دستور کا بھی آغاز کر دیا۔ جس کو آئندہ زمانوں میں بہت فروغ ہوا۔

یونان کی شہری مملکتیں اپنے نظام حکومت کے اعتبار سے دو حصوں میں منقسم تھیں۔ ان میں ایک قسم تو وہ تھی جن میں انفرادی آزادی پوری طرح حاصل تھی حکومت کا ہر شعبہ عوامی اقتدار کا تابع تھا اور عوام حکومت میں بلاواسطہ حصہ لیتے تھے۔ یہ یونانی جمہوریت کی انتہائی ترقی یافتہ شکل تھی اور اس کا علمبردار ایتھنز تھا۔ دوسری قسم وہ تھی جہاں مملکت کو فرد پر پورا اقتدار حاصل تھا۔ اور حکومت مفاد مملکت کے مطابق عوام کی تربیت کرتی اور ان پر نگرانی رکھتی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی با اقتدار جمہوری ادارے بھی قائم تھے اور عوامی اسمبلی کے اختیارات جمہوریت کے محافظ تھے۔ اس قسم کی ریاستوں میں اہم ترین اسپارٹا تھا۔ ایتھنز اور اسپارٹا دو ایسی مملکتیں ہیں جن کے نظام حکومت کا مطالعہ یونانی جمہوریت کے تمام پہلوؤں کو بخوبی واضح کر دیتا ہے +

مطبوعات بزم اقبالؒ

مجلۂ اقبالؒ مدیر:۔ ایم، ایم شریف۔ بشیر احمد ڈار

یہ مجلہ سہ ماہی ہے دو انگریزی اور دو اردو شماروں میں قیمت سالانہ دس روپے صرف اردو یا انگریزی شمارے پانچ روپے فی پرچہ دو روپے آٹھ آنے

میٹا فزکس آف پرشیا	(انگریزی) مصنفہ علامہ اقبالؒ	۵ — ۰ — ۰
ذکرِ اقبالؒ	مصنفہ مولانا عبدالمجید سالک	۵ — ۰ — ۰
اقبال اور ملا	مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم	۰ — ۱۲ — ۰
مکاتیب اقبالؒ	بنام خان محمد نیاز الدین خاں مرحوم	۱ — ۴ — ۰
تقاریر یوم اقبالؒ	۱۹۵۴ء	۱ — ۴ — ۰
علامہ اقبالؒ	مترجمہ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم	۱ — ۸ — ۰
جدید سیاسی نظریے	مصنفہ سی، ای ایم، جوڈ مترجمین عبدالمجید سالک و عبدالحئی	۲ — ۱۲ — ۰
غیب و شہود	مصنفہ سر آرتھر اسٹینلے ایڈنگٹن مترجم سید نذیر نیازی	۲ — ۱۴ — ۰

ملنے کا پتہ:۔ معتمد بزم اقبال و مجلس ترقی ادب ۲۔ نرسنگ داس گارڈن کلب روڈ۔ لاہور